ادب کا معاشرتی کردار اور موجودہ زندگی

The Social Cotribution of Literature and Contemporary Life,

ڈاکٹر ضیاء الحسن
پروفیسر و صدر نشین جمیل جالبی چیئر،
ادارہ زبان و ادبیات، اورینٹیل کالج، لاہور

Abstract:

Literature has been a lucid description of the society. It encompasses all the aspects of life as it is directly associated with behaviours, doings, feelings and responses of social beings. Since the day one, the man has reached the stages of an evolved man; the literature has been serving him. It is the part and parcel of human life. It solves the issues of individual and the society. The ultra-sensitive and extra-vigilant approach of writers has been unveiling the hidden facts of life. It has told the untold and showed the invisible. It has been doing and will be doing this all irrespective of limits of time, geography and religion.

کلیدی الفاظ: ادب، معاشرہ، انسان، زندگی، مذہب، سیاست، میرؔ، غالبؔ، شمس الرحمٰن فاروقی، مرزا اطہر بیگ

انسانی زندگی میں ادب کے کردار کا سوال مختلف ادوار میں اٹھایا جاتا رہا ہے۔ کبھی اس سے انسان کی باطنی تربیت کا کام لیا گیا، کبھی اسے معاشرتی انقلاب برپا کرنے والا آلہ کہا گیا، کبھی معاشرت، کبھی مذہب اور کبھی سیاست نے ادب کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرنا چاہا۔ بنیادی انسانی اداروں کا ادب سے التفات اس کی بے پناہ قوتِ تاثیر کی وجہ سے ہے۔ ادب کو مختلف طبقات نے اپنے مفادات کے حصول کے لیے انفرادی اور اجتماعی دونوں حوالوں سے استعمال کرنے کی کوشش کی لیکن انہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ ادب اعلیٰ تخلیقی دیانت داری سے پیدا ہوتا ہے۔ دوسرے، تیسرے، چوتھے درجے کے ادب میں بھی تاثیر ہوتی ہے لیکن بالترتیب کم سے کم۔

ادب براہِ راست انداز کو پسند نہیں کرتا کیونکہ اس سے ادب کی جمالیاتی اقدار مجروح ہوتی ہیں۔ ادب براہِ راست اثر انداز بھی نہیں ہوتا۔ ادب کا مخاطب انسانی باطن ہے۔ وہ باطن سے ربط استوار کر کے ظاہر پر اثرات مرتب کرتا ہے۔ یہ طریقہ کار طویل ضرور ہے لیکن اس کے نتائج گہرے اور دیرپا ہیں۔ فوری نتائج کے خواہاں اذہان کے لیے ادب کچھ ایسا کارآمد نہیں ہے کیونکہ وہ تبلیغ کا ذریعہ نہیں ہے۔ تبلیغی طریقہ کار کا تعلق

مذہب اور اخلاقی مصلحین سے ہے۔ ادب بالواسطہ طریقے سے تبدیلی کی طرف لے جاتا ہے، اگرچہ ادب اپنے عہد کے بنیادی مسئلے سے سروکار رکھتا ہے لیکن وہ اس مسئلے کا تجزیہ خود کرتا ہے اور اس کا حل بھی خود تجویز کرتا ہے۔ ادب سے براہِ راست، معاشرتی اور قومی خدمات کا مطالبہ کرنے والے مایوس ہوتے ہیں کیونکہ اس صورت میں ادب اپنے بنیادی جوہر سے محروم ہو کر محض پراپیگنڈا یا نعرہ بازی بن جاتا ہے اگرچہ یہ پراپیگنڈا یا نعرہ بازی بھی ادب کی تہذیب میں ڈھل کر اظہار پاتی ہے لیکن ادب کے تخلیقی جادو سے اس کا موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ ادب ایک زندہ اور محسوس کرنے والا وجود ہے۔ اس لیے اسے ہدایات جاری نہیں کی جا سکتیں۔ جس طرح عام انسان ہدایات اور معاشرتی ضوابط کے مطابق بہترین زندگی گزارتے ہیں اور خاص ذہن اپنے ضابطے خود ترتیب دیتے ہیں اور ان کے مطابق اعلیٰ تخلیقی کارنامے انجام دیتے ہیں، اُسی طرح ادب کو بھی معاشرے کا خاص وجود شمار کرنا چاہیے۔ عام معاشرتی فرد وقت کی پابندی پر عمل پیرا ہو کر بہترین نتائج پیدا کرتا ہے۔ وہ اپنے تمام افعال پابندی سے انجام دیتا ہے اور اس پابندی سے کارآمد معاشرتی فرد کا کردار ادا کرتا ہے۔ ایک تخلیق طبع ہر پابندی سے ماورا ہو کر اعلیٰ تخلیقی کارنامے انجام دیتی ہے۔ ایک معاشرتی فرد جس وقت نیند سے لطف اندوز ہوتا ہے، شاعر شعر کہتا ہے، شب زندہ دار عبادت اور فکر میں مشغول ہوتا ہے اور فلسفی، عالم یا سائنس دن جاگ کر غور و فکر کرتے ہیں۔ شاعروں، سائنس دانوں، فلسفیوں، عالموں اور صوفیوں کے لیے اعلیٰ تخلیقی جوہر کی آزادی ہر معاشرتی پابندی پر فوقیت رکھتی ہے۔ ان کے آزادی اور پابندی کے معیارات عام معاشرتی معیارات سے مختلف ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور پر تخلیقی حوالے سے کامیاب انسان معاشرتی حوالے سے ناکام سمجھے جاتے ہیں۔

یونانیوں نے ہزاروں سال پہلے صداقت، خیر اور حسن کو زندگی کی بنیادی اقدار کے طور پر دریافت کیا تھا۔ دیگر تمام اخلاقی، روحانی اور تخلیقی اقدار انہی بنیادی اقدار سے پیدا ہوتی ہیں۔ ادب انھیں اقدار کو انسانی باطن میں بیدار کر کے تخلیقی معاشرے کی بنیاد رکھتا ہے، یہی ادب کی آفاقی اقدار ہیں۔ ادب ہر عہد کو انھیں اقدار سے پرکھتا ہے اور جہاں کمی محسوس کرتا ہے، اس کو پورا کرنے کا طریقہ کار خود وضع کرتا ہے۔ ادب ایک سطح پر حالات کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ عکاسی بھی محض عکاسی نہیں ہوتی بلکہ اس میں ادب کا نقطۂ نظر پوشیدہ ہوتا ہے۔ جب میرؔ کہتے ہیں۔(1)

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاکِ پا جن کی
انہیں کی آنکھ میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

تو یہ محض عکاسی نہیں بلکہ جاہ طلبی پر طنز ہے اور معاشرتی انتشار کا تجزیہ بھی ہے ۱۷۳۹ء میں جب نادر شاہ نے ہندوستان کے ظاہر باطن کو اپنی تلوار سے فگار کیا تو ادب نے اس منتشر معاشرے کی عکاسی شہر آشوب، طنز وہجو اور علاج غزل میں تجویز کیا۔ اگر اس زمانے میں مولانا حالیؔ یا اختر حسین رائے پوری ہوتے تو وہ ادب سے براہِ راست کردار کے متقاضی ہوتے۔ ادب اس تمام انسانی المیے سے بے خبر تھا۔ اس عہد کا سب سے بڑا مسئلہ یہی زخم اور درد تھا۔ ادب نے تصوف کے استعارے میں اس دور کے درد کو سمیٹا اور انسانیت کے زخموں پر مرہم رکھا۔ آج ہمارے لیے اس صوفیانہ شاعری کو معاشرے کے مسائل سے فرار کہنا آسان ہے کیونکہ ہم اس دور کو محسوس کرنے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔ دوسرے یہ کہ ادب نے اس دور کے سیاسی، معاشی اور سماجی انتشار کا حل انسانی باطن میں موجزن انتشار کو ختم کرنے اور ایک نئ تہذیب کی تشکیل کو سمجھا۔ اس نئ تہذیب نے جس معاشرے کی تعمیر کی، اس میں موجود انسان میں اس درد کو برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ سیاست کے حوالے سے اس دور کے بڑے مسائل انتظامی انتشار، کمزور فوج، معاشی بدحالی اور بے روزگاری، لیکن ادب کے لیے اس دور کا بڑا مسئلہ زخم خوردہ اور درد سے تڑپتی ہوئی دکھی انسانیت کی روحانی تسکین اور تربیت تھی۔ ادب کے تجزیے اور دوسرے علوم اور اداروں کے تجزیے میں یہی بنیادی فرق ہے جس کی وجہ سے یہ بات جان لینی چاہیے کہ ادب کسی بھی ادارے کا طفیلی نہیں ہے بلکہ معاشرے کے دیگر اداروں مثلاً سیاست، مذہب وغیرہ جتنا بڑا اور عظیم ادارہ ہے۔ اس کی عظمت پر کمتر درجے کی مفاد پرست ادیبوں کے کردار سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ ہر دور میں سنجیدہ اور عظیم فکری و تخلیقی کمال کے حامل ادیب اپنے کام میں لگے رہتے ہیں اور انہی کی وجہ سے ادب کو کسی بھی معاشرے کے بنیادی ادارے کا مقام حاصل ہے۔ اس کا یہ مقام نہ کوئی مطلق العنان بادشاہ، نہ کوئی افلاطون جیسا فلسفی، نہ کوئی آمر، نہ کوئی تحریکی جبر اور نہ کوئی لالچ یا خوف ختم کرسکا ہے۔ ادب نے ادیبوں اور دانشوروں کے غیر ادبی اور غیر دانشورانہ رویوں کو بھی مسترد کیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سرسید اور ان کے رفقا نے ادب کو معاشرتی اصلاح کا فریضہ تفویض کیا۔ اس دور میں تصنیف ہونے والے ادبی کام کی معاشرتی اور قومی اہمیت اپنی جگہ لیکن ہم اس کام کو اعلیٰ تخلیقی کارناموں میں شمار نہیں کرتے۔ ادب کے ارتقا میں اس دور کو ایک مرحلے کی حیثیت حاصل ہے۔ اس دور کی اہمیت یہ ہے کہ اس نے ادب کے رکے ہوئے قافلے میں تحریک پیدا کی اور نئے موضوعات اور اسلوب کی جستجو کی لہر پیدا کی۔ اس کے نتیجے میں اردو ادب کو اقبال جیسا عظیم شاعر نصیب ہوا۔ اس طرح ۱۹۳۶ء میں بھی ترقی پسند تحریک کی صورت میں ادب میں بیرونی تحریک پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، اگرچہ ادب نے ترقی پسندوں کے تنظیمی ضابطوں کو مسترد کردیا لیکن اس تحریک نے جو ماحول پیدا کیا، اس میں منٹو، بیدی اور ن۔م راشدؔ جیسے تخلیقی فن کار پیدا ہوئے جنھوں نے ادبی نقطہ نظر پیش کیا۔ اگرچہ تحریکی رہنماؤں نے اس وقت ان کی مخالفت کی لیکن آج اس دور کے نمائندہ تخلیق کاروں میں انھیں

کو شمار کرتے ہیں۔ تحریکی ادیبوں میں ایک بھی راشدؔ جیسا شاعر اور ایک بھی منٹو یا بیدی جیسا افسانہ نگار نہیں ہے لیکن ان کی خدمات بھی قابل تحسین ہیں کہ انھوں نے راشدؔ، منٹو اور بیدی جیسے فن کاروں کی موضوعات واسالیب کی تلاش میں معاونت کی اور ایک ایسی فضا پیدا کی جس میں یہ ادیب بدلتی ہوئی زندگی کے مسائل سے خود کو ہم آہنگ کر سکیں۔ ادب کو ایسا کردار ادا کرنے والے ادیبوں اور دانشوروں کی بھی اتنی ہی ضرورت ہوتی ہے جتنی اعلیٰ تخلیقی فن کاروں کی۔ کبھی سراج الدین علی خان آرزوؔ ہندوستانی فارسی گو شاعروں کو ریختہ میں اپنا اظہار کرنے کی تحریک دلاتے نظر آتے ہیں تو کبھی مرزا مظہر جانِ جاناں ایہام گو شاعروں کو تازگی فکر واسلوب کی طرف متوجہ کرتے نظر آتے ہیں۔ نہ آرزوؔ کا اردو شاعری میں کوئی بڑا مقام ومرتبہ ہے نہ جان جاناں کا، لیکن ان کی یہ اہمیت مسلم اور لازوال ہے کہ ان کی کاوشوں سے اردو کو میرؔ وسوداؔ جیسے شاعر میسر آئے۔ گویا بدلتی زندگی میں موثر کردار ادا کرنے والے ادب کی تخلیق میں جتنی اہمیت اعلیٰ درجے کے تخلیقی فن کاروں کو حاصل ہوتی ہے اتنی ہی اہمیت ان ادیبوں اور دانشوروں کو بھی حاصل ہوتی ہے جو اس خاص فضا اور ماحول کی تعمیر میں کردار ادا کرتے ہیں، جس میں اعلیٰ تخلیقی فن کار بدلتی زندگی کے تقاضوں سے خود کو ہم آہنگ کر کے اس کے مطابق بہترین اسلوب دریافت کرتے ہیں۔ ادب کے اس تاریخی تجزیے سے ہم انسانی زندگی میں موئثر کردار ادا کرنے والے ادب کے تخلیقی عمل سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔ ہر دور میں ادب سب سے پہلے بنیادی انسانی سوال اٹھاتا ہے، پھر اس سوال کی روشنی میں چند درد مند ادیب وہ فضا تیار کرتے ہیں جس میں عظیم ادب کا استعمال کیا جاسکے۔

موجودہ صورتِ حال میں کوئی سیاسی طاقت ایسی نظر نہیں آتی جو ان خوف ناک حالات میں اپنا کردار ادا کر سکے۔ مذہب، جس نے کئی ادوار میں انسانیت کی بقا کے لئے اپنا کردار ادا کیا تھا اور اب بھی یہ کردار ادا کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے، اپنی دردمندانہ روح سے محروم، خود اپنی بقا سے قاصر اور باطنی انتشار کا شکار ہے۔ اشتراکی نظریہ، جس نے ایک زمانے میں دنیا کے کئی ممالک میں انسان کو اس کا کھویا ہوا منصب لوٹانے میں اہم کردار ادا کیا تھا، جمود کا شکار ہے۔ ایسے میں بدلتی ہوئی دنیا میں ادب کے کردار کا سوال اٹھایا گیا ہے، کیا ادب موجودہ بدلتی ہوئی زندگی میں کوئی کردار ادا کر سکتا ہے؟ اصولی طور پر اس کا جواب اثبات میں اور عملی حوالے سے نفی میں ہے۔ سرمایہ داری نظام جس نے انسان کو جاگیرداری ظلم سے نجات دلائی تھی، اب اس سے بڑے جبر کے طور پر دنیا پر مسلط ہے، اگرچہ اس کے سارے ہی انداز اس کے زوال کی نشاندہی کرتے ہیں لیکن اس کے لئے پوری انسانیت کو منظّم جدوجہد کی ضرورت ہے۔ یہ جدوجہد دراصل چند مجنون اور اقتدار پرست اذہان کے خلاف ہوگی جنھوں نے اپنے پاگل پن سے ساری انسانیت کے مستقبل کو داؤ پر لگایا ہوا ہے۔ انسانیت کی بقا کا سوال آج سے پہلے کبھی اتنی شدت سے نہیں ابھرا۔ ساری دنیا سرمایہ داروں کے جرائم سے بخوبی واقف ہے لیکن ان

کے پاس دنیا کو برباد کر دینے والے ہتھیار وافر تعداد میں موجود ہیں۔ انسان جانتا ہے کہ ان جنونی پاگلوں نے اگر ان کا استعمال کیا تو یہ سارا قصہ ہی مختصر ہو جائے گا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اصول توازن کے تحت انسان نے ڈائنو ساروں کی طرح ایک دوسرے کو کھانا شروع کر دیا ہے۔ شاید انسانیت کو آج سے زیادہ باطنی تربیت کی ضرورت کبھی نہیں رہی۔ اس وقت انسان کی بہیمانہ فطرت کے مقابل شکست خوردہ جذبہ انسانیت کو ابھارنے کی شدید ضرورت ہے۔ اس وقت انسان کو مذہبی، لسانی، نسلی، جغرافیائی اور نظریاتی تضادات کو حل کرنے والی آفاقی فکر کی ضرورت ہے۔ اس وقت زندگی اور ادب دونوں کے سامنے انسانی بقا کا سوال آ کھڑا ہوا ہے۔ اس دور میں تخلیق ہونے والے ادب کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے یا شاید اس دور کے ادب نے ابھی اپنا بنیادی مسئلہ دریافت ہی نہیں کیا۔ اردو کے موجودہ تخلیقی ادب کو دیکھا جائے تو کہیں کہیں اس بنیادی سوال کی بعض جزئیات نظر آ جاتی ہیں لیکن یہ سوال اپنی پوری آب و تاب سے ابھی طلوع نہیں ہوا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی بڑا تخلیق کار آ کر یہ سوال اٹھائے اور ایسی تخلیقی فضا قائم کر دے جس میں انسان کی باطنی کایا کلپ ہو سکے لیکن یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس دور کے غور و فکر کرنے والے دانشور یہ سوال اٹھائیں اور وہ فضا تعمیر کریں جس میں بڑے تخلیقی جوہر کا ظہور ممکن ہو سکے۔ یہ دور رنگ، نسل، زبان، جغرافیہ اور قوم کے تفریق کرنے والے شدید احساس سے معمور ہے، ادب کا نہ کوئی جغرافیہ ہے، نہ رنگ و نسل، نہ زبان، نہ مذہب اور نہ کوئی غیر انسانی تعصب۔ ہم روسی، عیسائی، ٹالسٹائی اور دوستوفسکی کو ہر تعصب سے بالاتر ہو کر پڑھتے ہیں اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یورپی یہودی کافکا کے بھی پرستار ہیں اور بھارتی سکھ راجندر سنگھ بیدی کے افسانے بھی ہمارے باطن میں رنگ بھرتے ہیں۔ ادب یہ مطالبہ بھی نہیں کرتا کہ اس پر ایمان لایا جائے۔ اس کے پاس کوئی تلوار یا جوہری بم بھی نہیں ہے کہ وہ جس سے ڈرا سکے۔ اس کے پاس کوئی فوج، پولیس یا جیل خانہ بھی نہیں ہے۔ وہ صرف مطالعے کا تقاضا کرتا ہے اور وہ بھی سب سے نہیں بلکہ معاشرے کے حساس اور غور و فکر کرنے والے محدود طبقے سے۔ باقی تمام کام ادب نے اپنے ذمے لے رکھا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ اس کا قاری لازماً اس کے جادو کا شکار ہو گا اور دوسروں کو بھی اس کا اسیر کر لے گا۔ اس طرح قاری اور قاری کے اثرات سے پورا معاشرہ اس تخلیقی فضا میں سانس لے سکے گا جو انسان کی بہیمانہ جبلت پر قابو پا سکتی ہے۔

ہمارے عہد کی زندگی کی ابتدا غالب کے دور سے ہوئی۔ غالب وہ پہلا ہندوستانی ہے جس نے اس صارفی معاشرے کو پہچانا جو آج ہم پر مسلط ہے۔ اس نے اپنے تخلیقی وجدان سے دریافت کیا کہ آنے والے زمانے میں مارکیٹ یا بازار کو مرکزی حیثیت حاصل ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری میں یہ لفظ اپنی پوری استعاراتی آب و تاب سے روشن ہوا۔(2)

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

انھوں نے ہمیں بتایا کہ مستقبل میں سرمائے کو خدا جیسی مرکزیت حاصل ہو جائے گی اور زر کے حصول کے لیے انسان خدا، رسولؐ، ماں باپ، بہن بھائی سب کو فروخت کرنے کے لیے تیار ہو گا۔(3)

غارت گر ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر
کیوں شاہد گل باغ سے بازار میں آوے

اقبالؔ نے اپنے زمانے میں سرمایہ داری نظام کے ایک اور مرکز کو پہچانا اور اس نظام کی غیر انسانی خصوصیات کے خلاف لکھا۔ انھوں نے جان لیا کہ جدید دنیا کا کعبہ بینک میں اور یہیں سے انسان کو انفرادی اور اجتماعی طور پر کنٹرول کیا جائے گا۔ ان کی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں جس دنیا کا اور جس انسان کا نقشہ کھینچا گیا ہے وہ ان کے دور میں کم اور آج زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آیا ہے۔

موجودہ دور میں ادب کا یہ فریضہ شاعری کے بس میں نہیں رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر کی مختلف زبانوں میں تخلیق ہونے والے ادب میں فکشن کو مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ اب ہم اپنی دنیا اور اس میں بسنے والے انسان کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں تو ہمیں فکشن کی دنیا سے ربط استوار کرنا پڑے گا۔ اکیسویں صدی میں دو ناول نگاروں نے اس دنیا اور اس میں بسنے والے انسان کو سمجھنے سمجھانے کی پوری کوشش کی ہے۔ شمس الرحمن فاروقی نے اپنے ناول "کئی چاند تھے سرِ آسماں" میں اس انسان کو پیش کیا ہے (4) جو ہمارے وجود سے مفقود ہو گیا ہے جبکہ مرزا اطہر بیگ نے اپنے ناول غلام باغ (5) میں اس انسان کو پیش کیا ہے جو گذشتہ پچھتر سال کی پاکستانی معاشرت اور ثقافت نے پیدا کیا ہے خصوصاً ان کے ناول "صفر سے ایک تک" میں اس زبان کو اختیار کیا گیا ہے، آج ہم جس میں سوچتے، محسوس کرتے اور بات کرتے ہیں (6)۔ ادب نے مختلف اصناف میں ہمیشہ اپنا یہ کردار ادا کیا ہے اور کرتا رہے گا۔

حوالہ جات وحواشی

1۔ میر تقی میرؔ، کلیات میر جلد اوّل،(لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۲ء)ص، 321

2۔ اسد اللہ خاں غالبؔ، دیوان غالب،(لاہور، الفیصل ناشرانِ کُتب، ۱۹۹۲ء)ص 51

3۔ ایضاً، ص 141

4۔ شمس الرحمن فاروقی، کئی چاند تے سرِ آسماں (کراچی، شہرزاد ۲۰۰۶ء)ص 12

5۔ مرزا اطہر بیگ، غلام باغِ،(لاہور، سانجھ ۲۰۰۶ء)ص 48

6۔ مرزا اطہر بیگ، صفر سے ایک تک،(لاہور، سانجھ: ۲۰۰۸ء)ص 124

Referencs

1. Meer Taqi MeerKulliyat e Meer,Vol.1 (Lahore, Majlis e Taraqqi Adab, 1992) P. 321
2. Ghalib,Asadullah Khan, Deewan e Ghalib (Lahore, Al Fisal NAshiran E Kutab, 1992) P. 51
3. Ibid, P 141
4. Shams Ur Rehman Farooqi, Kai Chand Thay Sar e Aasman (Karachi, Sheherzad) P. 12
5. Mirza At,har Baig, Ghulam Baagh (Lahore, Saanjh Publishers, 2006) P. 48
6. Mirza At,har Baig, Sifar Se Aik Tak (Lahore, Saanjh Publishers, 2008) P. 124